AL-MISBAH
RESEARCH JOURNAL
Recognized in "Y" Category Journal by HEC
ISSN (Online): 2790-8828. ISSN (Print): 2790-881X.

Volume IV, Issue II

Homepage: https://reinci.com/ojs3308/index.php/almisbah/index

Category Y

Link:https://hjrs.hec.gov.pk/index.php?r=site%2Fresult&id=1089437#journal_result

Article: بے بسی، مایوسی، تنہائی اور عدم شناخت کے تناظر میں زاہدہ حنا کے افسانوں کا وجودی مطالعہ

Authors & Affiliations:

[1] **Tamseela Yousaf**
Research Scholar, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.

[2] **Dr. Aqlima Naz**
Assistant Professor, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.

Email Add:
[1] tamseelabirmani@gmail.com
[2] aqlimanaz@fjwu.edu.pk

ORCID ID:
[1] https://orcid.org/0009-0003-9171-9722
[2] https://orcid.org/0009-0007-7771-5791

Published: 2024-04-25

Article DOI: https://doi.org/10.5281/zenodo.13206072

Citation: Tamseela Yousaf, and Dr. Aqlima Naz. 2024. " بے بسی ، مایوسی ،تنہائی اور عدم شناخت کے تناظر میں زاہدہ حنا کے افسانوں کا وجودی مطالعہ: AN EXISTENTIAL STUDY OF ZAHIDA HINA'S FICTION IN THE CONTEXT OF HELPLESSNESS, DESPAIR, LONELINESS AND NON-IDENTITY". AL MISBAH RESEARCH JOURNAL 4 (02):93-106. https://reinci.com/ojs3308/index.php/almisbah/article/view/274.

Copyright's info: Copyright (c) 2023 AL MISBAH RESEARCH JOURNAL

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

Published by Institute of Culture and Ideology, Islamabad.
+92-313-305-2561, +92-300-030-9933
www.almisbah.info

بے بسی، مایوسی، تنہائی اور عدم شناخت کے تناظر میں زاہدہ حنا کے افسانوں کا وجودی مطالعہ

AN EXISTENTIAL STUDY OF ZAHIDA HINA'S FICTION IN THE CONTEXT OF HELPLESSNESS, DESPAIR, LONELINESS AND NON-IDENTITY

* Tamseela Yousaf
* Dr. Aqlima Naz

ABSTRACT

Zahida Hina is a renowned Urdu fiction writer who has carved out a distinctive place for herself in contemporary literature. She has successfully shielded her work from the negative influences often associated with modern Urdu fiction while deftly incorporating the global and domestic contexts of her time into her short stories. She focus on history and politics in her fictions speacilly she made major part of her conscience to world politics. Her literary contributions extend beyond mere storytelling; her works serve as a mirror reflecting the tumultuous and often harsh realities of her time. Her stories frequently explore existential themes such as helplessness, despair, loneliness, fear, non-identity, anxiety, and death. This is largely because, from a young age, she was exposed to her elders' accounts of significant historical events such as the two world wars, the French Revolution, the Partition of India, and 9/11. These experiences profoundly influenced her, leading to the emergence of existential philosophy in her short stories. In this research, the existential elements in Zahida Hina's fiction are examined, particularly focusing on themes of helplessness, despair, loneliness, and non-identity.

Key words: Zahida Hina, existentialism, Urdu short story, non-identity, loneliness.

زاہدہ حنا اردو ادب کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ انھوں نے لکھنا شروع کیا مگر خود کو جدید اردو افسانے کے منفی اثرات سے محفوظ رکھا اور اس وقت کے عالمی اور ملکی حالات کو افسانوی پیرائے میں ڈھالا۔ اس وقت اسد محمد خان، حسن منظر، اے خیام اور رضیہ فصیح احمد بھی افسانہ نگاری کی طرف بڑھ رہے تھے اور افسانہ نگاری میں علامتی طرز کو رواج دے رہے تھے۔ تاہم زاہدہ حنا نے روایت پرستی کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ ایک الگ دبستان کی نمائندہ بن کر سامنے آئیں۔ کراچی میں اسد محمد خان تاریخی افسانے لکھ رہے تھے۔ حسن منظر اور رضیہ فصیح احمد اپنے افسانوں میں سیاسی و معاشرتی بیانیے کو موضوع بنا رہے تھے جبکہ زاہدہ حنا تاریخ اور سیاست کو موضوع بنا رہی تھی، خصوصاً عالمی سیاست کو انھوں نے اپنے شعور کا حصہ بنایا اور زندگی کا ادراک نئے سرے سے حاصل کیا۔ انھوں نے ایک ایسے معاشرے میں جہاں لوگ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے سے گھبراتے ہیں، سیاسی حقائق و واقعات کی حقیقی تصویریں افسانوں میں پیش کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

* Research Scholar, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.
* Assistant Professor, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.

ضیاالحق کا مارشل لاء کا عہد ادیبوں اور شاعروں کے لیے کافی تکلیف دہ تھا کیونکہ اس دور میں تحریر و تقریر پر ہر طرح سے پابندی عائد تھی لیکن زاہدہ حنا نے اس دور میں بھی اپنے قلم، آواز اور عمل کے ذریعے بغاوت کی۔

"زاہدہ حنا عہدِ جدید کی ایک ایسی باشعور افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے عہد کے متضاد رویوں، انسانیت کُش اعمال و افعال اور انسانی فکر کی آزادی سلب کرنے والے ہتھکنڈوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے امن و آشتی کا علم بلند کیا ہے۔"[1]

زاہدہ حنا کے افسانوں میں بے بسی، مایوسی، تنہائی، ڈر خوف، عدم شناخت، کرب، بے چینی اور موت کے علاوہ کئی وجودی عناصر جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زاہدہ حنا اپنے بزرگوں سے دوعالمی جنگوں، انقلابِ فرانس، تقسیمِ ہند اور ۱۱/۹ جیسے واقعات بچپن ہی سے سنتی چلی آرہی تھیں یہی وہ محرکات تھے جن کی بدولت وجودیت کے فلسفے نے جنم لیا۔ جس نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کو بھی کافی حد تک متاثر کیا۔ وجودیت عصرِ حاضر کی نمائندہ فکری تحریک ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔[2] وجودیت در اصل ایک ایسا فلسفہ ہے جو فرد کی زندگی اور اس کے تجربے کو ایک عمرانی صورتِ حال سے جوڑتا ہے۔ پروفیسر بختیار حسین صدیقی نے وجودیت کی تفہیم کچھ اس انداز میں کی ہے۔

"وجودیت وہ طرزِ فکر ہے جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلوؤں کی بجائے جذباتی پہلو پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ عقل تجربہ اور کلیت کے چکر میں پھنس کر دور ہی سے حقیقت کو ہاتھ لگا کر نکل جاتی ہے لیکن جذبہ وجود کے اندر گھس کر ہمیں دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتا ہے۔ بعض جذباتی کیفیات تو ایسی ہوتی ہیں۔ جن کی حیثیت نفسیاتی کم اور وجودی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ان مسائل پر روشنی ڈالتی ہے، جن کا تعلق براہ راست انسان کی اصل حقیقت اور اس کی منزلِ مقصود سے ہوتا ہے۔"[3]

زاہدہ حنا کے افسانوں میں بے بسی، مایوسی اور تنہائی جیسے وجودی عناصر بکثرت نظر آتے ہیں۔ افسانہ "زیتون کی ایک شاخ" کا مرکزی کردار امریکی نوجوان ایڈگر کوہن ہے جو جنگ سے شدید نفرت کرتا ہے کیونکہ اس کا باپ کسی جنگ میں شہید ہو چکا تھا، اب اس کی بیوہ ماں نہیں چاہتی کہ بیٹا بھی باپ کی طرح کسی جنگ کا نشانہ بنے لیکن اس کے باوجود ایڈگر کوہن کو جبراً جنگ میں بھیج دیا جاتا ہے اور وہ بھی جنگ میں باپ کی طرح مار دیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں بے بسی، مایوسی اور تنہائی جیسے وجودی عناصر کا واضح اظہار ملتا ہے۔ ایڈگر کی مایوسی اور بے بسی اس وقت غالب نظر آتی ہے جب اس کے والد کی جنگ میں مارے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ اس حوالے سے "زیتون کی ایک شاخ" میں ایڈگر کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"ہم نے انھیں ڈیڑھ سال سے نہیں دیکھا تھا اور ہم نے تو ان کا آخری دیدار بھی نہیں کیا ہم انھیں مہاگنی کے تابوت میں نہ لِٹا سکے، ڈیڈ کا تابوت کسی بمبار طیارے کا ڈھانچہ بنا اور ان کی یونیفارم ان کا کفن۔"[4]

درج ذیل اقتباس سے افسانے کے مرکزی کردار ایڈگر کوہن کی بے بسی، تنہائی اور مایوسی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں ایڈگر کی ماں کے دکھ کا اظہار ملتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت ایک بے بس مخلوق ہے جنگ میں ایڈگر کی ماں اپنے شوہر کو سب سے پہلے بھیجنے پر راضی ہو جاتی ہے اور جب اس کا شوہر جنگ سے واپس شہید ہو کر آتا ہے تو وہ حکومت کے آگے بے بس ہوتی ہے، کچھ نہیں کر سکتی اور اپنے بیٹے کو جنگ میں جاتا دیکھتی ہے تب بھی وہ بے بس اور مایوس دکھائی دیتی ہے اس حوالے سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جنگ پر جانا کس قدر ہولناک بات تھی میری نگاہوں میں ایڈگر کا شاندار سراپا گھوم گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حریت پسند کی گولی کا نشانہ بن جائے یا بارودی سرنگ پاؤں پڑتے ہی ان کے بدن کے چیتھڑے اڑ جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس طرح زخمی ہو کر ان کا ہاتھ یا ٹانگ کاٹ دی جائے مجھے ایڈگر کی ماں کا خیال آیا کہ وہ کس قدر بدنصیب عورت تھی اس کا شوہر جنگ کی بھینٹ چڑھا تھا اور اب اس کا بیٹا جنگ کے جہنم زار میں اترنے والا تھا میں لرز کر رہ گئی۔"[۵]

افسانے میں ہر کردار اپنی ذات میں تنہا، مایوس اور بے بس دکھائی دیتا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب میں نے ایم ایس کیا تو میں کسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کے خواب دیکھتا تھا لیکن وہ خواب ہی کیا جو پورے ہو جائیں اور اب مجھے خوابوں کی تعبیر یہ ملی کہ میں کسی کالج میں تاریخ پڑھانے کے بجائے ویت نام جا رہا ہوں وہاں لوگوں کو گولیوں کی زبان سکھاؤں گا۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی انگلیاں کاٹ کر پھینک دوں تاکہ میں کسی رائفل کی لبلبی دبانے کے قابل نہ رہوں۔"[۶]

اس اقتباس میں ایڈگر کوہن جو کہ افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ اسے زندگی کی ناآسودہ خواہشات کے سامنے بے بس اور مایوس دکھایا گیا ہے۔ "زیتون کی ایک شاخ" کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"تم مجھے نہیں جانتی لیکن میں اپنے بیٹے کے خطوط میں تمہارا ذکر بار بار پڑھ چکی ہوں۔ تم نے تنہائی کے چند عذاب ناک دنوں میں اس کا دکھ بٹایا تھا اور تمھارے خطوط سے اسے تسکین ہوتی تھی وہ اپنے ہی خط میں تمھیں نہایت محبت اور احترام کے ساتھ یاد کرتا رہا۔ میں تمھیں یہ خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میرا بیٹا اور تمھارا دوست آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہائی پھونک میں ختم ہوا۔ ایڈگر کی خواہش تھی کہ اگر وہ محاذ پر کام آجائے تو تمھیں ان کے انجام کی اطلاع دے دی جائے۔"[۷]

افسانے میں آغاز سے انجام تک ہر کردار مایوس، بے بس اور تنہائی کا شکار نظر آتا ہے۔

افسانہ "بود و نبود کا آشوب" کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جو معاشرے میں ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی ہے۔ جب اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جاتی ہے تو وہاں پر کسی فوجی افسر سے شادی کر لیتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب اسے شوہر کی اصلیت کا علم ہوتا ہے کہ

فوجی افسر ہونے کے باوجود اس نے بہت سے بے قصور لوگوں کی جان لی ہے۔ جس کی وجہ سے اسے خود سے نفرت ہو جاتی ہے وہ سوچتی ہے کہ میرے پیٹ میں پلنے والی جان اگر قئے کرنی کی شے ہوتی تو وہ اسے قئے کر کے اپنا وجود ہلکا کر لیتی۔

اس افسانے میں ایک عورت کا کردار ہے جسے شوہر کی اصلیت کا علم ہونے کے باوجود بے بس اور مایوس دکھایا گیا ہے۔ زاہدہ حنا نے ایک عورت کے کردار کے ذریعے پورے معاشرے کی عورتوں کی بے بسی اور مایوسی کو بیان کیا ہے۔

> "وہ ہنس رہے تھے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ انھوں نے اسے کس کس طرح سے اذیتیں دیں اور اس کی انگلیوں سے ناخن کس طرح کھینچے گئے اسے کتنے گھنٹے برف کی سل پر لٹایا گیا اور کتنی مرتبہ بجلی کے جھٹکے دیئے گئے ۔تب میں نے جانا کہ وہ ہلاک ہونے سے ہفتوں پہلے ہی قتل ہو چکا تھا اسے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور کیا گیا۔ اذیت ہر وہ اذیت جو ایک انسانی ذہن ہی سوچ سکتا ہے اسے اور اس کے ساتھیوں کو دی گئی۔"[۸]

انھوں نے سچ کا دامن کبھی نہیں چھوڑا، اپنے افسانوں میں سچ بات کرنے کی قائل نظر آتی ہیں۔ معاشرے جہاں لوگ حق بات کہنے سے کتراتے ہیں، وہاں زاہدہ حنا کھل کر سامنے آتی ہیں یعنی سچائی ان کے فن کا خاصہ ہے۔ محمد علی صدیقی نے زاہدہ حنا کے اس فن کا اعتراف ان کے افسانے "بود و نابود کا آشوب" کے حوالے سے یوں بیان کیا۔

> "یہ افسانہ عنفوان شباب کی رومان پرستی پر تازیانہ ہی نہیں بلکہ ایک غلط فکر کے خلاف احتجاج بھی ہے اور یہی وہ حاصلِ دانش ہے جسے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا گیا ہے کہ محتسب وقت بھی دیکھتا اور ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ زاہدہ حنا نے نرم اور دھیمے لہجے میں گھن گرج کے ساتھ سب کچھ کہہ گزرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو وہ کہہ سکتی تھی۔"[۹]

تاہم زاہدہ حنا نے اس عہد میں لکھنا شروع کیا جب اظہار پر ہر طرف سے پابندی عائد تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں۔

> "مارشل لاء کے دور میں اظہار پر کڑی پابندیوں کے پیشِ نظر انہوں نے فوجی آمریت یا مارشل لاء کے دور کا براہِ راست ذکر نہیں کیا بلکہ رمزیہ انداز اختیار کیا۔ اس ضمن میں زاہدہ حنا کے چار افسانے قابلِ ذکر ہیں 'آخری بوند کی خوشبو'، 'بود و نابود کا آشوب'، 'تتلیاں ڈھونڈنے والی'، 'رنگ تمام خوں شدہ' یہ چاروں افسانے ضیاء دور میں لکھے گئے۔"[۱۰]

یہاں حکمرانوں کے سامنے سر اٹھانے والوں کے خلاف جو سازشیں اور منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں کئی ایسے لوگ ہیں جو حکمرانوں کے سامنے بے بس ہیں۔ درج ذیل اقتباس میں زاہدہ حنا نے ایک طرف عورت کی مایوسی، بے بسی اور تنہائی کو موضوع بنایا ہے۔ یعنی ایسی عورت جو معاشرے میں ہونے والے ظلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بے بس ہے تو دوسری طرف ان لوگوں کی بے بسی کو بیان کیا ہے جو حکمرانوں کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے بے بس ہیں۔ حالانکہ عورت یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ جو مظلوم عوام ظلم کی چکی میں پسی جا رہی ہے، وہ سب اس کے اپنے شوہر کے کارن ہے لیکن وہ یہاں پر خود کو مایوس، تنہا اور بے بس پاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے

وجود میں پلنے والے اس بچے کو جو کہ اس کے اور شوہر کے پاکیزہ رشتے کا ثمر ہے۔ وہ اس بچے سے بھی نفرت کرنے لگتی ہے کہ اگر یہ بچہ قئے کرنے کی شے ہوتی تو وہ قئے کر کے اپنے وجود کو ہلکا کر لیتی۔ ایک اور اقتباس میں اس عورت کی بے بسی اور مایوسی ملاحظہ کریں۔

"میرے چاروں طرف آوازیں تھیں آگ تھی اور دھواں تھا خون کی اور سڑتے ہوئے گوشت کی بساند تھی۔ مجھے ابکائی آئی اور جو کچھ بھی میرے اندر تھا باہر آ گیا یہ سڑا رزق اس اذیت دہی کے عوض ملنے والے رویوں سے خریدا گیا تھا۔ میں اس سڑے ہوئے رزق کے پاس بیٹھی رہی میں جانے کتنی دیر بیٹھی رہی پھر میں ہمت کر کے اٹھی لیکن ابھی بہت کچھ میرے اندر تھا ابھی تو میرے اندر ایک عزیز از جان رشتے کی مسخ شدہ لاش تھی۔"[11]

"تتلیاں ڈھونڈنے والی" افسانے میں نرجس اور اس کا خاوند حصولِ آزادی کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جیل میں ان کا چار سال کا بچہ مہدی بھی ساتھ ہوتا ہے۔ نرجس جیل کی سختی کو برداشت کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ کبھی رحم کی اپیل نہیں کرتی اور وقت آنے پر پھانسی گھاٹ میں اتر جاتی ہے۔ اس افسانے میں نرجس کا کردار تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہے لیکن وہ اپنی بے بسی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی کیونکہ وہ خدا پر کامل یقین رکھتی ہے۔

"بی بی تمھیں ڈر نہیں لگتا؟ پھانسی گھاٹ منتقل ہونے کے چند دن بعد وارڈن مریم نے اس سے پوچھا تھا۔

کس بات سے ڈر؟ نرجس کے لہجے میں سکون تھا موت سے۔

نہیں موت پر جب اپنا اختیار ہو تو اس سے ڈر نہیں لگتا۔ پھر مہدی بھی تو ہے۔ وہ میرے بعد رہے گا اور میں اس میں رہوں گی۔ پھر جب وہ چلا جائے گا تو میں اس کے بچوں میں زندہ رہوں گی۔"[12]

افسانے میں ایک اور جگہ موت کے فلسفے کو نرجس کی زبانی منفرد انداز میں بیان کرتی ہیں۔

"آپا تمھیں خدا رسول کا واسطہ چپ رہو۔ بھیا بلکنے لگا اور وہ خاموش ہو گئی وہ اماں کی اور بھیا کی اذیت ان کا عذاب سمجھتی تھی لیکن یہ نہیں سمجھا سکی کہ کبھی انسان اپنے لیے موت منتخب کرتا ہے کہ دوسرے زندہ رہیں۔"[13]

اس افسانے میں نرجس اپنے وجود سے مایوسی، بے بسی اور تنہائی جیسے وجودی عناصر کو لیے ہوئے ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ پُر امید نظر آتی ہے اور وجودی عناصر کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی۔

"پشت پر بندھے ہوئے نرجس کے دونوں ہاتھ مہدی کو چھونے کے لیے پھڑکے پھر اپنی جگہ ساکت ہو گئے مہدی نیند میں ہنس رہا تھا شاید پریوں سے کھیل رہا تھا نرجس نے دھندلائی آنکھوں سے زندگی کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے جھک کر اس کا ماتھا چوما، رخسار چومے زندگی، زندگی سے رخصت ہو رہی تھی۔"[14]

افسانہ "تنہائی کے مکان میں" کا مرکزی کردار ماسومی ہے۔ جس کا خاندان جاپان میں ہونے والے ایٹمی حملے میں تباہ ہو گیا تھا۔ ماسومی لندن کے کسی ادارے میں کام کرتی ہے۔ افسانے میں ماسومی اپنے دوستوں کو ہیروشیما اور ناگاساکی میں ہونے والی ایٹمی تباہی سے متعلق بتا رہی ہے

جس میں اس کا پورا خاندان ایٹمی دھماکے کی نذر ہو چکا ہے۔ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو ماسومی کو جن حالات سے گزرنا پڑا، اس کا ذکر افسانے کے اس اقتباس میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

"اچانک سارا آسمان گلابی روشنی سے بھر گیا اور روشنی رنگ بدلنے لگی نیلا، گلابی، سرخ، بھورا، زرد اور کاسنی اسی لمحے میں نے ماں کی چیخ سنی۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں سمٹے ہوئے کپڑے کہاں چلے گئے تھے اور وہ خود سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح جل رہی تھی میں نے چیخنا چاہا لیکن میرے اندر آواز نہیں رہی تھی۔"[۱۵]

افسانہ نگار نے اس افسانے میں جہاں ماسومی جیسے مرکزی کردار کی بے بسی اور تنہائی کو بیان کیا ہے وہاں ان دوسرے لوگوں کی بے بسی کو بھی بیان کی ہے جو اس ایٹمی حملے سے متاثر ہوئے تھے۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میری آنکھ کھلی تو میں سیاہ بستر پر تھی۔ میرے گھر کی دیواریں نہیں تھیں چھت نہیں تھی ماں نہیں تھی۔ آس پاس کچھ بھی نہیں تھا بس آگ تھی دھواں تھا میں نے اٹھ کر چلنا چاہا تو میرے پاؤں جلے ہوئے تھے اور آنکھیں سوج کر آدھی بند ہو چکی تھیں۔ گلی جانے کہاں چلی گئی تھی راستے بھی نہیں رہے تھے۔ لوگ بے نور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جھلسے ہوئے پیروں پر چلتے ہوئے سر جھکائے کسی ایک طرف جا رہے تھے شاید وہی راستہ تھا ان لوگوں کے بدن نہیں چیتھڑے تھے لاوے کی طرح اُبلتا ہوا گوشت چہروں، ہاتھوں اور پیروں سے لٹکی ہوئی کھال۔"[۱۶]

اس افسانے میں ہیروشیما، ناگاساکی پر ہونے والی ایٹمی تباہی کو موضوع بنا کر ماسومی کی تنہائی اور بے بسی کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس طرح زاہدہ حنا نے ایک اور افسانے "آخری بوند کی خوشبو" میں سائیں فیض بخش اور ان کی بیٹی نوری کی بے بسی اور مایوسی کو اچھوتے اور خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ افسانے میں اس وقت کے حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے جب ملک پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ افسانے کا مرکزی کردار فیض بخش ہے۔ فیض بخش کو ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔ غربت اور بے روزگاری کی وجہ سے اس کی بیٹی کی شادی نہیں ہو پاتی اور وہ غریبی کا داغ لیے اس فانی دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ باپ کی بے بسی اور مایوسی کو اس افسانے میں پر اثر انداز میں دکھایا گیا ہے۔

آخر کار ایک ایسا وقت بھی آیا جب ملک میں سڑکوں پر ہر طرف موت کا خوف نظر آیا اور لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ دہشت گردی کے اس دور میں فیض بخش کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ افسانے میں نوری جیسے نسوانی کردار کی مایوسی اور بے بسی کو موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب انسان کچھ بھی نہ کر سکتا ہو تو چپ رہنے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟ آٹا کل رات ختم ہو گیا تھا۔ صبح اور دوپہر کو ان دونوں نے مٹھی بھر کھجور اور مکئی کے بھنے ہوئے دانوں پر گزارہ کیا تھا۔ نوری کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اب گھر میں کچھ بھی نہیں رہا ہے۔"[۱۷]

اس طرح فیض بخش کے مایوسی اور بے بسی کے رویے کو افسانہ نگار "آخری بوند کی خوشبو" میں یوں بیان کرتی ہیں جس میں غربت کے باعث مایوسی اور بے بسی جیسے وجودی مسائل کو نوری کی زندگی کا حصہ بنایا گیا۔ اس حوالے سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"وہ اپنی تقدیر پر شاکر ہو چکے تھے اور تمام آرزوئیں ان کے وجود سے رخصت ہو چکی تھیں وہ خواب جو ان کے دوستوں نے انھیں کانپور میں دکھائے تھے وہ لمحوں کے پروں پر بیٹھ کر اتنے دور نکل گئے تھے تصور کے جال میں بھی نہیں آتے تھے۔"[۱۸]

تمام عمر فیض بخش کو ایک ہی صورت حال سے گزرنا پڑا۔ اچھے دنوں کے خواب جو ان کے دوستوں نے دکھائے تھے، وہ بھی بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گئے جس کی وجہ سے ساری زندگی مایوسی ان کا مقدر بنی رہی۔ اسی طرح ایک اور اقتباس میں فیض بخش کی تنہائی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ایک سہ پہر ان کے گھر کی کنڈی کھٹکی۔ انھیں حیرت ہوئی ان کے گھر کا دروازہ اب دن رات کھلا رہتا تھا گھر میں رہ کیا گیا تھا۔ جسے محفوظ رکھنے کے لیے کنڈی لگائی جاتی پھر کون تھا جو کھلے ہوئے شکستہ دروازے پر دستک دے رہا تھا۔"[۱۹]

درج بالا اقتباس میں شاہ پور کی بیوی اور بیٹی کی موت کے بعد تنہائی کو ظاہر کیا گیا ہے۔

افسانہ "یکے بود یکے نہ بود" میں بے بسی تنہائی اور مایوسی کا موضوع پورے افسانے پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار شاہ پور جو فن کوزہ گری میں مہارت رکھتا ہے۔ اس کا خاندان ایران کے شہر قزدین کا رہنے والا ہے۔ بچپن میں جب اس کے والدین کی وفات ہو جاتی ہے تو وہ مایوس کا خوف اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے لیکن اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ شاہ پور کے چچا کو جب اس کی خودکشی کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ اس کے بعد شاہ پور امریکہ چلا جاتا ہے، امریکہ میں اس کی شادی رودابہ نامی لڑکی سے ہوتی ہے۔ اس کردار کی بے بسی دیکھیے کہ پہلے بچے کی پیدائش پر بچہ اور ماں دونوں ہی موت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

شاہ پور اپنے والدین کی وفات کے بعد جس طرح کے داخلی کرب سے دوچار ہوا اور جس طرح کے مایوسی، تنہائی اور بے بسی جیسے وجودی عناصر نے اس کو گھیرا۔ اس کا واضح اظہار ایک اقتباس میں یوں ملتا ہے کہ

"شاہ پور بارہ برس کا تھا تو ماں رخصت ہوئی۔ دو برس بعد باپ بھی چل بسا۔ شاہ پور نے ماں اور باپ کے تعاقب کی کوشش کی لیکن جب اس میں ناکام رہا تو ایک رشتہ دار کی دکان پر کوزے بنانے لگا۔ اس کا چچا کراچی میں تھا کسی کی زبانی اسے بھائی کی موت اور بھتیجے کی خودکشی میں ناکامی کا علم ہوا تو خون نے جوش مارا اور اس نے کسی دوست کی مدد سے بھتیجے کو کراچی بلا بھیجا۔"[۲۰]

درج ذیل اقتباس میں شاہ پور کے والدین کی وفات کے بعد شاہ پور کی تنہائی، بے بسی کو بیان کیا گیا ہے۔ شاہ پور تنہائی اور بے بسی کے ساتھ مایوسی میں بھی مبتلا نظر آتا ہے۔

امریکہ میں شاہ پور کی شادی رودابہ سے ہوئی لیکن رودابہ کی موت شاہ پور کو پھر سے تنہائی، مایوسی اور بے بسی کی طرف لے آئی اور وہ پاگل پن کا شکار ہو گیا۔ اس حوالے سے افسانہ "یکے بود یکے نہ بود" کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "ہمارا گھر جنت تھا، لیکن جب وہ ختم ہوئی تو جہنم بن گیا۔ شاہ پور پہلے تو اس کی تدفین پر ہی تیار نہ تھا۔ بمشکل رودابہ کی نڈھال ماں نے اسے راضی کیا۔ پھر قبرستان سے واپس آیا تو اپنی بنائی ہوئی ہر چیز توڑ دی۔ وہ بیلچہ لے کر اپنے بیڈ روم میں گھس گیا اور دیوار پر لگی ہوئی ٹائلوں میں سے کسی کو سلامت نہیں چھوڑا۔"[۲۱]

افسانہ "زمین آگ کی آسماں آگ کا" کا مرکزی کردار "شہنشاہ بانو" جو شادی کے بعد بھی اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی ہے لیکن شادی کے بعد اس کے لیے یہ سب ناممکن تھا۔ وہ پڑھی لکھی عورت ہے مگر جب شادی کے بعد اس کے خاوند دلارے میاں نے جب اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو کتاب پھاڑ دی اور اس کی تمام کتابوں کو جلا دیا اور اس کے ہاتھ کاٹنے کی دھمکی بھی دی۔ اس افسانے میں شہنشاہ بانو کی بے بسی کا عنصر تب غالب نظر آتا ہے جب چالیس سال کی عمر میں اسے طلاق ہو جاتی ہے جب وہ نان نفقے کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کے خلاف جلسے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ افسانے میں شہنشاہ بانو کی بے بسی کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "شہنشاہ بانو دالان میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں جب دلارے میاں تیز تیز قدموں سے انھیں اپنے کمرے میں جاتے دکھائی دیئے چند لمحوں بعد وہ ان کے کپڑوں کا بکس گھسیٹتے ہوئے باہر نکلے۔ "اٹھاؤ اپنا سامان اور نکل جاؤ اس گھر سے" وہ گرجے۔ شہنشاہ بانو نے چائے کا پیالہ پلنگ کی پٹی پر رکھ کر انھیں حیرت سے دیکھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ "کہاں جاؤں"[۲۲]

اس اقتباس میں زاہدہ حنا نے شہنشاہ بانو جیسی عورت کی بے بسی کو موضوع بنا کر پورے معاشرے کی عورتوں کی بے بسی کا ذکر ان کے اس افسانے میں نمایاں ہے۔ دوسرے اقتباس میں یوں رقمطراز ہیں۔

> "اس شام کی یاد سے شہنشاہ بانو کی بوڑھی ہڈیوں کو کپکپی چڑھنے لگی اس روز آسمان ان کا نہ تھا، زمین ان کی نہ تھی جب وہ دروازے کی طرف دو قدم چلیں اور تیورا کر گرنے لگیں۔"[۲۳]

اس افسانے سے متعلق ڈاکٹر فاطمہ حسن یوں رقم طراز ہیں۔

> "یہ کہانی نسائی شعور کی بہترین مثال قرار دی جا سکتی ہے۔ کہانی میں جگہ جگہ ایسے مقامات آتے ہیں جو روایت اور مذہب کا سہارا لے کر عورت کے استحصال کے مروج رویے کو کتابوں کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں مگر کہانی پر دستاویز کی چھاپ نہیں لگتی، نہ ہی لکھنے والی کوئی سیاسی یا سماجی کارکن بن کر نعرہ لگاتی نظر آتی ہے۔ زاہدہ حنا نے اس کہانی میں بڑی چابکدستی سے معاشرتی سچائیاں پیش کی ہیں۔"[۲۴]

تاہم آج کے دور میں تعلیم یافتہ عورت کو اپنی ذات کے اندر اور باہر دونوں اطراف ایک سی جہتوں کا سامنا ہے۔ تعلیم اپنے ساتھ آگہی اور اپنے حقوق کا شعور لاتی ہے جو ہمارے معاشرے کو بالکل پسند نہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ عورت اپنی تخلیقات اپنے نام کے ساتھ نہیں چھپوا

سکتی تھی لیکن اب ایسا نہیں وہ نہ صرف اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکتی ہے بلکہ عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم کو سامنے لا کر اس میں عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس بھی دلاتی ہے۔ اسی طرح زاہدہ حنا بھی عورتوں کے مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

جدیدیت میں فرد کے جذبات کے بجائے اس کو خارجی اور سائنسی فارمولوں سے پرکھنے کی کوشش کی گئی اور سائنس ہی کو صداقت کا معیار سمجھا جانے لگا اور عقل کو تمام مسائل کا حل جانا گیا، اس طرح وہ فرد پیدا ہوا جو معاشرے سے کٹا ہوا اور خارج کے بجائے داخل میں گم ہونے والا تھا۔

سارتر نے وجودیت کی وضاحت کرنے کے لیے کئی دلائل پیش کیے۔ ژاں پال سارتر فرد کی آزادی کے حوالے سے کہتے ہیں۔

> انسان ایک ایسی ہستی ہے جس کا وجود جوہر پر مقدم ہے اور یہ کہ وہ آزاد ہے اور ہر حالت میں آزادی کے سوا اور کچھ نہیں چاہ سکتا تو ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں دوسروں کی آزادی کو چاہے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔[۲۵]

جب جنگ میں ہزاروں، لاکھوں لوگوں کی اموات واقع ہوئیں تو اس میں اجتماع کا نوحہ ملتا ہے لیکن کسی ایک فرد کی اپنی نہ تو کوئی پہچان تھی اور نہ ہی فرد کا اپنا کوئی تشخص تھا یعنی فرد اجتماع میں گم ہو چکا تھا۔ اس طرح کے نظریات اور خیالات نے انسان کو بے بس اور تنہا کر دیا، اس کی خوشیوں کو اجتماع کی خوشی کے ساتھ لازم قرار دیا گیا۔ اس طرح جدید فرد سماج کو اپنی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ تصور کرنے لگا اور پھر اپنی ذات کی تلاش کے سفر پر گامزن ہوا اور اپنے وجود کے تشخص اور شناخت کے لیے اس نے وجودی فکر کو اپنایا۔ ڈاکٹر سی اے قادر اس بارے میں کہتے ہیں۔

> وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بیگانگی یا غیریت کا فلسفہ ہے۔ یہ اس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی تمام اقدار کھو بیٹھتا ہے۔۔۔ یہ دور یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا۔۔۔ جنگوں نے اخلاق اور مذہب دونوں کو تباہ کر دیا۔ نوجوانوں کو احساس ہوا کہ ماضی کا اخلاق، ان کے مسائل حل نہیں کر سکتا اور مذہب کی طفل تسلیاں ان کی بے چینی کو دور نہیں کر سکتیں۔ اگر پرانی اقدار ختم ہو چکیں، مذہب ناکارہ ہو چکا ہے اور فلسفہ دور از قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی درد کا مداوا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب وجودیت نے پیش کیا۔[۲۶]

زاہدہ کے افسانوں میں بھی کردار تنہائی اور بیگانگی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ عدم شناخت کے باعث کرداروں کو کئی طرح کے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ افسانہ "ناکجا آباد" میں اداس نسل کی تنہا خاتون کی کہانی ہے جو کسی چبوترے سے ٹیک لگائے اپنے ماضی کے لوگوں کے ہجوم کے درمیان اس طرح گھری ہوئی ہے جس کی اس ہجوم میں اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ اس افسانے میں قیام پاکستان کے بعد کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے کہ جب لاکھوں لوگ ہجرت کر کے دوسری جگہ پناہ گزیں ہوئے تو انھوں نے اپنی جان تو بچا لی لیکن اپنی شناخت کھو بیٹھے جو ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بن گیا۔ افسانے کی مرکزی کردار ایک ایسی عورت، جو ہجرت کے باعث نئے گھر میں آباد ہوئی لیکن عدم شناخت کی وجہ سے کئی طرح کی

نفسیاتی الجھنیں اسے اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔ اس افسانے کی کہانی واحدِ متکلم میں بیان کی گئی ہے۔ کردار جو کہ کہانی کو بیان کر رہا ہے وہ عدم شناخت کے باعث کئی طرح کی نفسیاتی الجھنوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے افسانہ "ناکجا آباد" کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب ان ستونوں اور محرابوں پر دروں اور دیواروں پر میری نظر پڑتی ہے تو مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے وہ گھر جو مجھ سے زیادہ یہاں باتیں کرنے والوں کا گھر تھا لیکن اگر میں یہ باتیں با آواز بلند سوچنے لگوں تو لوگ قہقہے مار کر ہنسیں گے اور مجھ سے پوچھیں گے کہ کس گھر کی باتیں کرتی ہو؟ تمھارا گھر تو یہ ہے کہ جس کے چبوترے سے ٹیک لگائے تم کھڑی ہو اس کے سوا تمھارا گھر بھلا کہاں ہے؟ اور ان لوگوں کو ہنسنا ہی چاہیے کیونکہ انھیں معلوم نہیں کہ گھر اینٹوں سے بنی ہوئی چار دیواری، چھت اور کمروں کا نام نہیں گھر تو وہ جگہ ہے جو ہمارے اندر بسی ہوئی ہے۔"[۲۷]

درج بالا اقتباس میں کردار عدم شناخت کے باعث تنہائی، بے بسی اور خود کلامی جیسے وجودی مسائل کا شکار نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے افسانے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میں اپنے آس پاس کھڑے جامن اور پیپل کے پیڑوں کو دیکھتی ہوں اور حیران ہوتی ہوں۔ نہ جانے یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ انھیں اس زمین میں کس نے لگایا تھا ان کی جڑیں زمین میں جانے کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ پیڑ ان لوگوں کی باقیات ہیں جو آج یہاں نہیں ہیں اور جانے کہاں ہیں جن کا حسب نسب وقت کی اکھاڑ پچھاڑ میں گم ہو چکا اور اب یہ بے حیثیت اور گم نام ہیں۔ میں بھی انھی کی طرح بے حیثیت ہوں۔"[۲۸]

افسانے میں داستان گو نے عدم شناخت کے باعث خوف، دہشت اور خود کلامی جیسے وجودی عناصر کو اپنے وجود سے وابستہ کر رکھا۔ اس افسانے میں کردار عدم شناخت کے باعث وہ ذہنی کرب و کشمکش، الجھن اور بوریت جیسے مسائل سے دوچار ہے۔ اس حوالے سے افسانہ "ناکجا آباد" سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس خالی گھر میں ہوا گزری ہوئی آوازوں، کہی ہوئی باتوں اور بھولی بسری یادوں کا ناٹک رچاتی ہے۔ پردہ اٹھتا ہے اور پردہ گرتا ہے، پردہ اٹھتا ہے اور پھر اٹھتا ہی چلا جاتا ہے حجاب درمیان میں آتے ہیں اور بڑھتے چلے جاتے ہیں آواز ابھرتی ہے پھر معدوم ہو جاتی ہے عدم اور وجود سب وقت کا کھیل ہے اور آواز بھی عدم میں ایک وجود ہے عدم میں ایک وجود؟ یہ بھی خوب رہی، سر بریدہ آوازیں، بصارت سے محروم مناظر اور آنے والے دنوں کے چھلاوے میرے سامنے موت کا رقص کرتے ہیں اور جب میں چیخیں مارتی ہوں تو یہ تمام سراب اور سائے معدوم ہو جاتے ہیں یہ جو عدم سے وجود میں آئے تھے پھر معدوم ہو جاتے ہیں لیکن میرے لیے واپسی کی تمام راہیں مسدود ہیں۔"[۲۹]

اس افسانے میں پاکستان کے قیام کے بعد کا منظر نامہ بیان کیا گیا ہے، جب لوگ ہجرت کر کے ایک ملک سے دوسرے ملک آ رہے تھے تو ایسے میں اس نئی جگہ پر ہمیں اپنی شناخت جیسے اہم مسئلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس کے باعث کئی طرح کی نفسیاتی و ذہنی کشاکش اور الجھنوں کے ساتھ وہ جگہ ذہن سے کبھی نہیں نکل سکتی، جہاں اس نے اپنا بچپن گزارہ ہو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

"بچے پلیٹوں میں پڑی ہوئی چیزوں پر ٹوٹ پڑیں گے بڑے انھیں سلیقے سے کھانے کی ہدایت کریں گے اور بوڑھے کھانس کھانس کر اپنے وجود کا احساس دلائیں گے پھر یہ سب لوگ باتیں کرنے لگیں گے۔ حال کی باتیں، مستقبل کی باتیں، اگلی فیکڑی کا منصوبہ، آئندہ ہفتے خریدے جانے والے پلاٹ کا ذکر، ان لائسنسوں کا تذکرہ جن کے وہ خوب دیکھتے ہیں جن کی حصول کی خاطر وہ اپنا آپ بیچ سکتے ہیں۔"[۳۰]

اس طرح افسانے کا کردار عدم شناخت کی وجہ سے امکان جیسے وجودی عنصر سے دوچار نظر آتا ہے اس حوالے سے افسانہ "ناکجا آباد" کا اقتباس کچھ یوں ہے کہ

میں سوچتی ہوں کہ وہ گھر اب کس حال میں ہو گا جس کی روشنی پر چھائیں میرے وجود پر اپنا سایہ ڈالتی ہیں شاید اس کی چھتیں گر گئی ہوں اور دیواریں ڈھ گئی ہوں۔"[۳۱]

افسانے میں کردار عدم شناخت کے سبب اپنے وجود کے ساتھ پریشانی، بے بسی، اداسی، بے چینی جیسے وجودی مسائل میں مبتلا نظر آتا ہے۔

افسانہ "آنکھوں کے دیدبان" کی کہانی واحدِ متکلم کی صورت نظر آتی ہے۔ زاہدہ حنا ایک ایسی عورت کے بارے میں بتاتی ہیں جو اپنے وجود کی شناخت کی تلاش میں ساحل سمندر کا رخ کرتی ہے۔ سمندر بھی اسے اپنی ذات کی طرح بے حیثیت اور گم نام سا لگتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ سمندر کی لہریں اس کی طرف آنا چاہتی ہیں لیکن وہ بھی بے بس ہیں۔ اس طرح جب وہ اپنی ذات سے باہر نکلتی ہے تو اسے دیگر چیزوں کا خیال آتا ہے تو وہ ان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے وہ وقت کے بارے میں سوچتی ہے اور اس کو شکل دینا چاہتی ہے لیکن یہاں بھی اسے بے بسی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ افسانے میں عدم شناخت کے باعث کردار تنہائی، بے بسی، بے زاریت کا شکار نظر آتا ہے۔

"میں ہر رات اپنے گرد باد کے قدموں سے اٹھ کر یہاں اس شفاف دیوار تک آتی ہوں اور سمندر کو دیکھتی ہوں میں حصارِ ذات سے باہر کیسے آؤں کہ میری آنکھیں میرے دیدبان ہیں۔"[۳۲]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کردار عدم شناخت کے باعث بے چینی اور پریشانی میں مبتلا ہے۔

"میں سامنے والے اپنے وجود کو چھوتی ہوں لیکن وہاں کچھ بھی نہیں ہے سب کچھ خواب در خواب ہے سراب اندر سراب اور خلا ہے کائنات بھی معدوم ہے اور سمندر کی لہریں جو مجھے نظر آ رہی ہیں وہ بھی کہیں نہیں ہیں میری آنکھیں جن چیزوں کو دیکھ رہی ہیں میرے ہاتھ انھیں چھونے پر قادر نہیں۔"[۳۳]

افسانے کا کردار عدم شناخت کے باعث اس قدر پریشان اور بے چین ہے کہ اسے صرف اپنے ارد گرد کی اشیا ہی نہیں بلکہ اپنا وجود بھی غیر یقینی اور بے معنی لگنے لگتا ہے۔

سمندر میں بلا کا اضطراب، بے چینی، گہرائی اور وسعت پائی جاتی ہے اور اس اضطراب کو زاہدہ حنا عورت کے وجود میں بے چینی سے مماثلت قرار دیتی ہیں۔ افسانہ "آنکھوں کے دیدبان" میں عورت کی ذات میں موجود بے چینی کی کیفیات کو یوں بیان کیا ہے۔

> "یہ سمندر جو شفاف دیوار کے اس پار دور تک سویا ہوا ہے کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سویا ہوا سمندر کروٹ بدل کر اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کی رات بھی ایسی ہی رات ہے آج شام ہی سمندر کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن کیا چیز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا جب وہ تمام زنجیریں توڑ کر اٹھ بیٹھے گا اور میرے پاس چلا آئے گا۔"[۳۴]

اس افسانے میں عدم شناخت کے حوالے سے بات کی گئی ہے کہ جب انسان کی شناخت معدوم ہو جاتی ہے تو ایسے انسان کی حالت اس بھٹکے ہوئے راہی کی سی ہو جاتی ہے جسے اپنی منزل کا پتا نہیں ہوتا، عین اسی طرح اس افسانے میں واحد متکلم کا کردار بھی عدم شناخت کے باعث بوکھلاہٹ کا شکار نظر آتا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب انسان اپنی ذات کی تلاش کے سفر پر نکلتا ہے تو اسے کہیں سے کوئی مثبت پہلو نظر نہیں آتا۔ اس افسانے میں بھی ایسی عورت کی داستان بیان کی گئی ہے جو ہر شام اپنی ذات کی تلاش کے سفر پر ساحل سمندر کا رخ کرتی ہے لیکن اسے کہیں سے کوئی مثبت پہلو نہیں ملتا، جس کی وجہ سے اسے تنہائی، بوریت اور بے بسی جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس افسانے کی کہانی واحدِ متکلم میں بیان ہو رہی ہے۔ کردار کی شناخت نہ ہونے کے باعث کردار خوف، دہشت اور خود کلامی جیسے وجودی عناصر کے علاوہ بیگانگی کا شکار ہے۔

زاہدہ حنا کے افسانوں میں عدم شناخت کے مسائل کا احاطہ افسانہ "شیریں چشموں کی تلاش" میں کردار عدم شناخت کے باعث دنیا میں پریشانیوں، دکھ درد اور غموں جیسے وجودی عناصر سے دوچار نظر آتا ہے۔ اس طرح کردار اپنی تلاش کے سفر میں کشتی میں سوار ہو کر ایسی جگہ کا متلاشی نظر آتا ہے جہاں وہ پُر سکون زندگی بسر کر سکے لیکن اس سفر میں بھی اسے عدم شناخت کے باعث کئی طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> "ہم جو اپنی روحوں کا بوجھ اٹھاتے پھرتے ہیں اس وجدان کا ادراک نہیں رکھتے ہم اس نابینا کی طرح ہیں جو فاقوں سے قریب المرگ ہے کیوں کہ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ اس کے پاس روٹی خریدنے کے لیے درہم و دینار نہیں۔"[۳۵]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کردار عدم شناخت کے باعث بوکھلاہٹ کا شکار نظر آتا ہے اور خود کو نابینا سے تشبیہ دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ اقتباس سے یہ بات بھی عیاں ہے کہ افسانے کا کردار جب اپنی شناخت کے سفر پر نکلتا ہے تو اس سفر میں رستے کی تمام تر مشکلات کے ساتھ ساتھ نان نفقے کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے۔

خلاصۂ تحقیق:

زاہدہ حنا کی تحریریں نہ صرف ان کے عہد کے تاریخی اور سماجی مسائل کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ وہ انسان کی داخلی دنیا کے مسائل کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ ان کے افسانوی کرداروں کے ذریعے یہ عیاں ہوتا ہے کہ انسان کی جدوجہد، اس کی تنہائی، اور اس کی بے بسی ایک عالمگیر حقیقت ہے، جو ہر دور اور ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے۔ ان کرداروں کے توسط سے، زاہدہ حنا نے انسان کے داخلی احساسات اور اس کی نفسیاتی کشمکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے، جو ان کے افسانوں کو نہایت حقیقت پسند اور دل کو چھو لینے والا بناتا ہے۔ ان کی تحریریں ہمیں دکھاتی ہیں کہ ماضی کے تلخ تجربات اور موجودہ مسائل کس طرح انسان کی شخصیت پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں، اور یہ کہ ہر فرد کی کہانی ایک مشترکہ انسانی تجربے کی عکاس ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر زاہدہ حنا ایک ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی افسانہ نگاری کے ذریعے موجودہ عہد میں ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی علوم کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ مضامین پر بھی ان کی گہری نظر رہی ہے۔ انہوں نے تاریخی واقعات کو بڑے اچھوتے انداز میں اس طرح کرداروں میں ڈھالا ہے کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہتا۔ جنگوں سے لے کر ہجرت کے تلخ تجربات اور پھر ان جنگوں اور ہجرت کے نتیجے میں حاصل ہونے والے انسانی بحران اور المیے کو باقاعدہ وجودیت جیسے فلسفے کے زیر اثر بیان کرنا کافی کٹھن کام ہے، یہاں افسانہ نگاری کے فکر و فن کا امتحان ہوتا ہے۔ خاص کر فلسفیانہ موشگافیوں کو کہانی کے روپ میں کرداروں کی زبان میں پیش کرنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے تاہم زاہدہ حنا ان باتوں سے بخوبی آگاہ نظر آتی ہیں۔ انہوں نے انسانی المیے، انسانی احساسات و جذبات اور انسانی کرب و تنہائی کو بڑے خوبصورت اور پر اثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔

حوالہ جات:

[1] عذرا پروین، " اردو افسانے کی دو نمائندہ انقلابی نسائی آوازیں (ڈاکٹر رشید جہاں اور زاہدہ حنا)" مشمولہ: جرنل آف ریسرچ (اُردو)، بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان، شمارہ ۲۸، (دسمبر ۲۰۱۵ء)، ص ۶۲۔

[2] قاضی جاوید، (دیباچہ) وجودیت (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۸ء)، ص ۹۔

[3] بختیار حسین صدیقی، پروفیسر، " وجودیت کیا ہے" مشمولہ: راوی، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور، ج ۶۱، ش ۲، (۲۰۱۳ء)، ص ۷۔

[4] زاہدہ حنا، تتلیاں ڈھونڈنے والی (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۳۰۔

[5] محولہ بالا، ص ۳۲۔

[6] محولہ بالا، ص ۳۰۔

[7] محولہ بالا، ص ۴۳۔

[8] محولہ بالا، ص ۱۳۶۔

۹ محمد علی صدیقی،(فلیپ)قیدی سانس لیتا ہے(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)۔

۱۰ فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات(اسلام آباد:یورپ اکادمی،۲۰۱۰ء)،ص۳۴۴۔

۱۱ زاہدہ حنا، تتلیاں ڈھونڈنے والی، محولہ بالا، ص۱۳۷۔

۱۲ محولہ بالا، ص۲۱۸۔۲۱۹۔

۱۳ محولہ بالا، ص۲۱۷۔

۱۴ محولہ بالا، ص۲۲۵۔

۱۵ محولہ بالا، ص۲۵۲۔

۱۶ محولہ بالا، ص۲۵۳۔

۱۷ محولہ بالا، ص۲۵۸۔

۱۸ محولہ بالا، ص۲۹۱۔

۱۹ محولہ بالا، ص۲۹۱۔

۲۰ محولہ بالا، ص۱۹۴۔

۲۱ محولہ بالا، ص۲۱۳۔

۲۲ محولہ بالا، ص۱۸۱۔

۲۳ محولہ بالا، ص۱۸۱۔

۲۴ فاطمہ حسن،ڈاکٹر،کتابِ دوستاں(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)،ص۷۸۔۷۹۔

۲۵ ژاں پال سارتر،وجودیت اور انسان دوستی،مترجم:قاضی جاوید(لاہور:مشعل پبلشرز،س ن)،ص۳۸۔

۲۶ سی-اے قادر،ڈاکٹر،"وجودیت"،مشمولہ:ادب۔فلسفہ اور وجودیت،مرتبہ:شیما مجید،نعیم احسن(لاہور:نگارشات،۱۹۹۲ء)،ص۸۲۔

۲۷ زاہدہ حنا، تتلیاں ڈھونڈنے والی،ص۱۰۔۱۱۔

۲۸ محولہ بالا، ص۱۳۔

۲۹ محولہ بالا، ص۲۱۔

۳۰ محولہ بالا، ص۱۰۔

۳۱ محولہ بالا، ص۱۱۔

۳۲ محولہ بالا، ص۷۶۔

۳۳ محولہ بالا، ص۷۴۔۷۵۔

۳۴ محولہ بالا، ص۷۱۔

۳۵ محولہ بالا، ص۹۰۔